زمانہ وعرف کی تبدیلی کی بنیاد پر شرعی احکامات میں تبدیلی: تجزیاتی مطالعہ

حافظ محمد مشتاق*

محمد یوسف فاروقی**

Abstract:
Islam is basically religion of nature whose objective is to formulate the sharai injunctions for the welfare of humanity. Human nature has always been given a special importance while explaining these injunctions and no decree has been issued that goes against man's natural aptitude. Man naturally different from others as for as his living, customs, color and generation, language and expression and culture and civilization are concerned. Moreover, the change of time also influences man 'needs and problems .Islam offers such a comprehensive and eternal code of life as is practicable even for the last person on this earth. The incidents of every age have been kept in view for the solution of issues in Islamic shariah due to this religion is as practicable even today as it was 14centries ago. Where the other sources have been employed for the elaboration of sharai injunctions in the Holy Quran and sunnah,there 'the change of zamana(time) andUrf" has also been allowed to be used as a origin. There are certain issues in the Holy Quran and sunnah which are directed towards the change in time and space and the habits of people for their final solution. For this, there is the condition that those habits do not counter the principals presented by the religion. After this the Sahaba and scholars presented the solution of many issues on the basis of urf-o-zamana.The objective of presenting the solution on this basis is to facilitate general public, In this article "The change in the sharai injunctions on the basis of Urf-o-zamana--An Analytical study" has been highlighted so that an open-hearted passion may be developed in the people for the comprehension of Islam.

Keywords: sharai injunctions, change, Urf-o-zamana, Analytical study

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں مختلف قسم کی مخلوقات کو پیدا کیا جن کی ضروریات ،رہن سہن, زندگی کے طور طریقے اور موسمی حالات وضروریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اسی طرح مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں میں بسنے والے انسانوں کی حاجات اور مسائل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔لوگوں کے رنگ و نسل ،زبان وبیان ، تہذیب وتمدن ،رسوم ورواج، طور طریقے اور رہن سہن میں اختلاف کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔اسلام قیامت تک آنے والی انسانوں کے لیے راہنما اصول فراہم کرتا ہے اور ہر دور کے لوگوں کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود یہ دین اسلام ہی ہے جو کہ اپنی اصلی حالت کو برقرار رکھتے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔اس کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جسے یہ امتیاز حاصل ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام میں احکامات کی

*لیکچرار، گورنمنٹ ڈگری کالج، ایمن آباد، گوجرنوالہ

** شریعہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تشریح و تعبیر میں فطرت انسانی کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے اسلام ہر دور کے لوگوں کے رسم ورواج اور عرف و عادات کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے احکامات صادر فرمائیں ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ حدود قیود بھی قائم کیں ہیں تا کہ ان کے اندر رہتے ہوئے عرف وزمانہ کی بنیاد پر مسائل کی تشریح کی سکے، کیونکہ اگر مختلف علاقوں اور مختلف زمانوں کے لوگوں کے لیے ایک جیسے ہی بعض احکامات جاری کر دیے جاتے تو ان پر عمل درآمد کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا شریعت اسلامیہ نے بعض فروعی نوعیت کے مسائل کے حتمی فیصلے کے لیے قرآن وسنت کی حدود قیود میں رہتے ہوئے عرف وزمانہ کی تبدیلی کو بھی شامل کیا ہے۔ شریعت اسلامیہ کا مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے قابل عمل قوانین کے ساتھ ساتھ ایسے معاشرے کا قیام عمل میں لانا ہے، جس میں غلط رسوم ورواج کا خاتمہ ہو اور اچھی عادات کا راج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے جس معاشرے میں شجر اسلام کا بیج بویا گیا اور پھر اس کی آبیاری ہوئی اس میں بہت سی خامیوں کے ساتھ ساتھ اچھائیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ لہذا اسلام نے نہ تو ان کی ساری عادات کو رد کیا اور نہ ہی ساری رسوم ورواج کو قبول کیا، بلکہ جن رسوم ورواج کو بہتر سمجھا اور لوگوں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ جانا انہیں قبول کر لیا، اور جہاں انسانی فلاح کا کوئی عنصر نظر نہ آیا اور ایک طبقہ کا استحصال ہوتا نظر آیا اس کو رد کر دیا۔ یہی وجہ ہے بعض علماء نے عرف کو ایک مستقل مصدر شریعت گردانا ہے اور اس کی بنیاد پر مسائل مستنبط کیے ہیں۔ یہ فقہ اسلامی کی زرخیزی و شادابی کی دلیل ہے کہ مخلوق خدا کے درمیان فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی میں مسائل کی تشریح و تعبیر میں فقہاء اسلام نے عرف وزمانہ کو خاص اہمیت دی ہے۔ دیگر فقہی مذاہب کی طرح فقہ حنفی میں بھی بہت سے مسائل ایسے جن کے بارے فتویٰ زمانہ وعرف کی تبدیلی کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔

عرف کا لغوی واصطلاحی مفہوم:

عرف سے مراد ایسے قوانین جن کو فطرت تسلیم کرتی ہو اور اسے شرعا حجت مانتی ہو۔ عرف کا تعلق انسان کی فطرت سلیمہ سے ہے اور شریعت اسلامی انسانی فطرت کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے۔ لہذا فقہ حنفی میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جن میں ائمہ احناف نے عرف کی بنیاد پر فیصلے کیے ہیں اور اسے بطور حجت تسلیم کیا ہے۔ اس کی تفصیل سے پہلے انتہائی اختصار سے عرف کی لغوی و اصطلاحی مفہوم کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ علامہ ابن منظور اپنی کتاب لسان العرب میں "عرف" کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ والعُرْفُ والعَارِفَة والمَعرُوفُ وَاحِدٌ: ضِدُّ النُّكْرِ، وَهُوَ كلُّ مَا تَعْرِفه النَّفْسُ مِنَ الخيْر وتَبْسَأُ بِهِ وتَطمئنّ إِلَيْهِ(1) عرف، معارف اور معروف ایک ہی چیز ہے جو کہ منکر کی ضد ہیں اور عرف کا مطلب ہے ہر وہ بھلائی جس سے انسانی طبیعت شناسا اور اس سے خوش اور مطمئن ہو جائے۔

اس تعریف سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عرف سے مراد ایسی چیز ہے جس سے انسانی طبیعت مانوس ہو اور انسانی فطرت اسے فورا قبول کرلے، یہی اسلام کا مقصد و مدعا ہے کہ کسی ایسی بات کا حکم نہ دیا جائے جس سے انسان کی طبیعت متنفر ہو جائے۔

امام ابو الحسین عرف کی تعریف کچھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:'' العرف :المعروف وسمی بذالک لان النفوس تسکن الیہ ''(2) عرف کو معروف بھی کہتے ہیں اور یہ نام اس کو اس لیے دیا گیا ہے لوگ اس (عرف) سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح خطائی کہتے ہیں:ما تعارف علیه الناس في عاداتهم ومعاملاتهم (3)

عرف سے مراد ایسے امور ہیں، جن سے لوگ اپنی عادات اور معاملات کے حوالے متعارف ہوں۔

علامہ بدر الدین عینی عرف کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔" مَا يتعارف النَّاس" عرف سے مراد ایسا حکم ہے جس سے لوگ متعارف ہوتے ہیں۔(4) ان تعریفات سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرف سے مراد لوگوں کے روز مرہ کے معمولات اور عادات ہیں، جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت اسلامیہ میں احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح شرعی مسائل کی تشریح کرتے ہوئے اہل علم کو بھی عرف وزمانہ کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

قرآنی آیات سے استدلال

عرف سے مسائل کے استنباط سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ کیا قرآن نے احکامات صادر کرتے ہوئے عرف کا لحاظ رکھا ہے اور اس کی بنیاد پر مسائل مستنبط کرنے کی اجازت دی ہے یا نہیں۔ کوئی بھی مصدر جو کہ قرآن وسنت کے متضاد ہو یا اس کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو، اسے کسی صورت بھی بطور مصدر استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کے مطابق کوئی فیصلہ دیا جا سکتا۔ ذیل میں عرف کے بارے قرآن وحدیث سے چند مثالیں بطور دلائل پیش کی جاتی ہیں۔

دودھ پلانے والی ماں کے نان ونفقہ کا فیصلہ قرآن کے نزدیک عرف وزمانہ اور خاوند کی مالی حیثیت کے مطابق کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔"وَعَلَي الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (5) اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے۔ دودھ پلانے والی ماؤں کے نان ونفقہ کا انتظام کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے مگر وہ اخراجات کتنے ہونے چاہییں اور ان کی نوعیت اور معیار کیا ہونا چاہیے، اس کی تعیین کے لیے قرآن نے عرف سے مدد لینے کا حکم دیا ہے، تاکہ دستور اور خاوند کے معاشی حالات کے مطابق کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ اس آیت کی تشریح میں ابو بکر الجصاص حنفی کہتے ہیں:

اس آیت میں ماؤں کی اجرت کا تعین کرنے لیے اجتہادی رائے کی طرف ترغیب دی گئی ہے جو کہ مختلف لوگوں کے (مالی) حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ اس نان ونفقہ کو خاوند کی مالی حالت کے ساتھ معتبر سمجھا جائے گا اور یہ غالب ظن اور اجتہاد کے ذریعے فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ مکلف نہیں بنایا لہذا عورت کا نان ونفقہ آدمی کی مالی وسعت پر مبنی ہے۔(6)

اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اخراجات میں خاوند کی معاشی حالت اور زمانہ کے رسوم وروج کے بدلنے سے اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر دور میں نہ تو لوگوں کی معاشی حالت ایک جیسی رہتی ہے اور ہی زمانہ کی عادات ورسم ورواج ایک جیسے رہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر و تبدل کا ہونا ایک فطری عمل ہے، لہذا خاوند کی مالی حالت کی روشنی میں بیوی کے نان ونفقہ میں تغیر ہوتا رہے گا کیونکہ قرآن نے اس کا فیصلہ اجتہادی آراء پر، اور ان کی عادات پر چھوڑ دیا ہے۔ مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ معاوضہ کی کوئی بھی شکل ہو گی اس کا فیصلہ وعرف وزمانہ کی بنیاد پر مرد کی معاشی حیثیت کے مطابق کیا جائے گا۔ یہ آیت عرف وزمانہ کو بطور دلیل استعمال کرنے کا شرعی جواز فراہم کرتی ہے۔ ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(7) پھر جب وہ اپنی عدت (پوری ہونے) کو آپہنچیں تو پھر جو کچھ وہ شرعی دستور کے مطابق اپنے حق میں کریں تم پر اس معاملے میں کوئی مؤاخذہ نہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح خبر دار ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر ارشاد ربانی ہے ۔﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾(8) اے حبیب مکرّم!) آپ درگزر فرمانا اختیار کریں، اور بھلائی کا حکم دیتے رہیں۔ اسی آیت مبارک میں عرف کو منکر کے متضاد کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ عرف کا حکم دینے کا مطلب ہے کہ طریقہ تبلیغ لوگوں کی عادات اور ان کے رہن سہن کے مطابق ہونا چاہیے۔ علامہ ابن العربی مالکی اس آیت کی تشریح میں چار اقوال نقل کرتے ہیں۔

الْأَوَّلُ: الْعُرْفُ: الْمَعْرُوفُ؛ قَالَهُ عُرْوَةُ.الثَّانِي: قَوْلُ لَا إلَهَ إلَّا اللَّهُ.الثَّالِثُ: مَا يُعْرَفُ أَنَّهُ مِنْ الدِّينِ.الرَّابِعُ: مَا لَا يُنْكِرُهُ النَّاسُ مِنْ الْمَحَاسِنِ الَّتِي اتَّفَقَتْ عَلَيْهَا الشَّرَائِعُ.(9)

1-اس سے مراد معروف چیز ہے 2-عرف سے مراد لَا إلَهَ إلَّا اللَّهُ.3-عرف سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ وہ دین میں سے ہیں۔ 4-وہ چیزیں ہیں جن پر تمام شریعتیں متفق ہوں اور جن کا لوگ انکار نہ کر سکیں۔

اس آیت میں بھی عرف سے مراد ایسا حکم ہے جو سب شریعتوں کے لیے قابل قبول یعنی (لا الہ الا اللہ) ہو جن پر تمام شریعتوں کو ماننے والے متفق ہوں اور لوگ جن کا انکار نہ کر سکیں۔ عرف کو بطور مصدر استعمال کرتے ہوئے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جو شریعت کے کسی اصول کی خلاف ورزی کر رہی ہو، اگر ایسا ہوا تو ایسے عرف کو ترک کرنا لازم ہو جاتا

ہے۔ قرآنی آیات میں واضح ہو جاتا ہے کہ فقہی مسائل کو مستنبط کرنے کے لیے عرف کو بطور ایک مصدر استعمال کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن نے کچھ مسائل کو حل کرنے کے لیے عرف کا استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔

عرف کا شرعی جواز احادیث کی روشنی میں

جس طرح قرآن نے عرف وزمانہ کی بنیاد پر مسائل کی تشریح کرنے کی اجازت دی ہے اسی طرح احادیث میں بھی عرف سے مسائل مستنبط کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے اجازت دی ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ حضرت ھند بنت عتبہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے روایت کرتی ہیں۔'' أَنَّ هِنْدَ بِنْتَ عُتْبَةَ، قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ وَلَيْسَ يُعْطِينِي مَا يَكْفِينِي وَوَلَدِي، إِلَّا مَا أَخَذْتُ مِنْهُ وَهُوَ لاَ يَعْلَمُ، فَقَالَ: «خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ، بِالْمَعْرُوفِ''(10)حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہندہ بنت عتبہ نے نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ابوسفیان بہت بخیل آدمی ہے، وہ اتنا خرچ نہیں دیتے جو میرے اور میرے بچے کے لیے کافی ہو، لہذا ان کو بتائے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لوں تو کیا (یہ میرے لیے جائز ہو گا؟) آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لیے اور تیرے بچے کے لیے جو کافی ہو، معروف طریقے سے لے لیا کرو۔ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امام ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں "وَالْمُرَادُ بِالْمَعْرُوفِ الْقَدْرُ الَّذِي عُرِفَ بِالْعَادَةِ أَنَّهُ الْكِفَايَةُ۔" اس عرف سے مراد وہ مقدار ہے جو عادت اور ضروریات کے لیے کافی ہو۔(11)

آپ ﷺ نے ہندہ کو اپنا خرچہ زمانہ ودستور کے مطابق لینے کی اجازت دے دی، عرف سے مراد ہے کہ اس زمانہ کے حالات وضروریات کے مطابق معاشی تقاضے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جس قدر اس کی ضروریات بآسانی پوری ہو سکتی ہوں۔ اس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ ہر زمانہ کی خواتین کو چاہیے کہ اپنے نان ونفقہ کا فیصلہ زمانہ وعرف کے ساتھ اپنے شوہر کے معاشی حالت کو سامنے رکھ کر کریں، جو مختلف خواتین کے لیے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ میں خواتین کے نان ونفقہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی گویا کہ شادی شدہ خواتین کے اخراجات کا تعین کرتے ہوئے اجتہادی رائے کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے عرف کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(12)

تم پر اپنی عورتوں کا کھانا لباس بھی معروف طریقے سے ہے۔ اس حدیث کی تشریح میں ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّ لِلْمَرْأَةِ مَعَ النَّفَقَةِ عَلَى الزَّوْجِ كِسْوَتَهَا وُجُوبًا وَذَكَرَ بَعْضُهُمْ أَنَّهُ يَلْزَمُهُ أَنْ يَكْسُوَهَا مِنَ الثِّيَابِ كَذَ وَالصَّحِيحُ فِي ذَلِكَ أَنْ لَا يُحْمَلَ أَهْلُ الْبُلْدَانِ عَلَى

نَمَطٍ وَاحِدٍ وَأَنَّ عَلَى أَهْلِ كُلِّ بَلَدٍ مَا يَجْرِي فِي عَادَتِهِمْ بِقَدْرِ مَا يُطِيقُهُ الزَّوْجُ عَلَى قَدْرِ الْكِفَايَةِ لَهَا الْوَلَدِ''(13)

اس بات پر علماء کا تفاق ہے کہ عورت کے لیے اس کے شوہر پر کھانے کے ساتھ لباس کا خرچ دینا بھی واجب ہے۔ اور بعضوں نے کہا کہ لباس شوہر کے لیے لازم ہے، اور اس بارے میں درست بات یہی ہے کہ تمام شہر کے لوگوں کو ایک ہی طریقے پر نہیں رکھا جاسکتا۔ لہذا اس مسئلہ میں شہر والوں پر وہی لازم ہو گا جو ان کے عرف وعادت کے مطابق شوہر اپنی استعداد کے مطابق نفقہ جاری کرے گا۔

آج کے دور میں نان ونفقہ میں فقط غذا اور لباس ہی شامل نہیں بلکہ اس میں بہت سی دیگر ضروریات زندگی بھی شامل ہیں جو کہ عورت کو دی جائیں گی۔ اس کا فیصلہ لوگوں کے رہن سہن، رسم ورواج اور خاوند کی معاشی حیثیت کو مد نظر رکھ کر کیا جائے۔

دین اسلام چونکہ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے احکامات لاگو کرتا ہے، اس کا مقصد لوگوں کے لیے مشکلات نہیں بلکہ آسانیاں پیدا کرنا ہے۔ عرف در حقیقت لوگوں کے مجموعی رواج اور عمل کا نام ہے۔ اگر عامۃ الناس کا کوئی ایسا عمل ہو جو شریعت کے خلاف نہ بلکہ اس میں عامۃ الناس کا اجتماعی مفاد نظر آرہا ہو تو اس کو شرعی حیثیت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ما رأى المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وما رأوا سيئا فهو عند الله سيئ (14) جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں پس وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوتی ہے اور جس چیز کو مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہوتی ہے۔

یہ روایت بتاتی ہیں کہ قرآن کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنت مبارک کے ذریعے بھی اس بات کی وضاحت فرمادی کہ لوگوں کے مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے عرف وزمانہ کا لحاظ رکھا جائے، زمانے کی رسوم ورواج کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تاکہ عامۃ الناس کے لیے بہتر فیصلے کیے جاسکیں۔ بعض مسائل تو ایسے بھی سامنے آتے ہیں ان کا حل تلاش کرنے کے لیے عرف وزمانہ کی تبدیلی لازمی جزو بن جاتا ہے۔ مگر اس سارے عمل میں اس بات کا خاص رکھا جائے گا کہ عرف اور زمانہ کی بنا پر کوئی فیصلہ بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔

زمانہ و عرف کی اہمیت: ائمہ کی نظر میں

قرآن وحدیث کے بعد تمام ائمہ وفقہاء نے بھی مسائل واحکامات بیان کرتے ہوئے زمانہ وعرف کے تغیر کو ملحوظ رکھا ہے۔اوراس کی اہمیت کے پیش نظر بعض مسائل اسی بنیاد پر نہ صرف حل کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ عرف وعادت کو بطور دلیل استعمال کیا ہے۔ذیل میں مختلف ائمہ کے اقوال کی روشنی میں عرف کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اصول فقہ کی روشنی میں فقہی آراء کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ ہمیشہ قابل اعتماد قول کیا جائے اور نا پسندیدہ امر سے گریز کیا جائے ان سارے مراحل میں لوگوں کے معاملات پر نظر رکھی جائے۔جب تک لوگوں کے معاملات کی صلاحیت متاثر نہ ہو اس وقت تک قیاس سے کام لیا جائے مگر جب قیاس میں قباحت پیدا ہو جائے تو استحسان کی طرف رجوع کیا جائے اور جہاں استحسان بھی کام نہ دے تو لوگوں کے عام معمولات کو دیکھا جائے۔(15)

شریعت اسلامیہ میں بعض مسائل اجمالی طور پر بیان کر دیے گئے ہیں اور ان کی تشریح و تعبیر کے لیے مختلف مصادر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔اسی طرح امام ابو حنیفہؒ جہاں دیگر مصادر سے مسائل پر استدالال کرتے ہیں اسی طرح بعض مسائل "عرف وزمانہ" کی بنیاد پر بھی اپنا اجتہاد پیش کرتے ہیں۔گویا عرف وزمانہ دین اسلام کی تشریح و تعبیر میں ایک دلیل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں عرف وزمانہ کو بطور ایک ماخذ کے استعمال کیا جاتا ہے۔

جب کوئی مسئلہ، نص سے نہ ملے اور نہ اس پر قیاس واستدلال سے کام لیا جاسکتا ہو تو پھر عرف کو سامنے رکھا جاتا ہے ۔فقہ حنفی کا یہ اصول نہ صرف امام ابو حنیفہؒ بلکہ دیگر ائمہ احناف نے بھی اختیار کیا ہے۔فقہاء احناف عرف کو قانونی حیثیت دیتے ہوئے اس کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔احناف کی کتب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عرف کو دلیل کا ایک معتبر ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔علامہ ابن عابدین اپنی کتاب "شرح عقود رسم المفتی" میں عرف کی شرعی حیثیت کے بارے لکھتے ہیں۔

عرف بطور حجت استعمال ہوتا ہے، اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جاتا ہے اور حدیث عام ہو تو خاص ہو جاتی ہے۔(16)امام سرخسی حنفی اپنی کتاب "المبسوط" میں عرف کی اہمیت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔"الثابت بالعرف کاالثابت بالنص"(17)عرف سے ثابت ہونے والا حکم ایسے ہی جیسے نص سے ثابت ہونے والا حکم ہو۔ شرح السیر الکبیر میں امام سرخسیؒ لکھتے ہیں "المعروف بالعرف کالمشروط بالنص"جو چیز عرف کی وجہ سے مشہور ہو جائے تو وہ عرف اس شرط کی مانند ہے جو نص کے ذریعے لگائی گئی ہے۔(18)ابن قیم اپنی کتاب "اعلام المؤقعین" میں عرف کے بارے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

تَغْيِيرِ الْفَتْوَى، وَاخْتِلَافِهَا بِحَسَبِ تَغَيُّرِ الْأَزْمِنَةِ وَالْأَمْكِنَةِ وَالْأَحْوَالِ وَالنِّيَّاتِ وَالْعَوَائِدِ(19) فتویٰ کی تبدیلی اور اس میں اختلاف کے اسباب میں سے زمان ومکان کی تبدیلی، لوگوں کے احوال ونیات میں تبدیلی اور ان کی عادات میں تبدیلی وغیرہ شامل ہیں۔ امام ابن عابدین کہتے ہیں کہ شریعت کے کچھ مسائل تو ایسے ہیں جو نص صریح سے ثابت ہوتے ہیں اور بعض مسائل ایسے ہیں جو اجتہاد اور رائے کی بنیاد پر ثابت ہوتے ہیں، لیکن بہت زیادہ مسائل ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں فتویٰ دینے کے لیے مجتہد عرف وزمانہ کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اور ایسے مسائل میں پہلے والوں سے اختلاف کا سبب بھی زمان ومکان کا تغیر ہی ہے لہذا اجتہاد کی شرائط میں سے ہے کہ مجتہد لوگوں کی عادات کو جانتا ہو۔ کیونکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں "اختلاف رائے" زمان ومکان اور عرف کی تبدیلی کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔(20)

دوسرے مقام پر ابن عابدین عرف وزمانہ کو مجتہد کے لیے لازم قرار دیتے ہیں، بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ کوئی بھی مفتی اپنے زمانہ کے عرف کے خلاف فتویٰ نہیں دے سکتا۔ لازمی بات ہے اس عرف سے مراد ایسا عرف ہے جو شریعت کے تابع ہو گا۔

علامہ ابن عابدین شامی نے مفتی کے لئے زمانہ کے عرف اور اہل زمانہ کے احوال سے واقفیت کو لازم قرار دیا اور عرف سے واقفیت کے لئے ایک ماہر استاد کی شاگردی کو ضروری ٹھہرایا اور عرف کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وهذا صريح فيما قلنا ان المفتى لأيفتى بخلاف عرف اهل زمانه'' یعنی مفتی اپنے اہل زمانہ کے عرف کے خلاف فتویٰ نہیں دے گا۔ آپ نے مفتی کے لیے عامۃ الناس کے احوال سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جستجو پر زور دیا اور یہ بھی فرمایا: ''جو مفتی اہل زمانہ سے واقف نہ ہو، وہ جاہل ہے''(21)

ائمہ احناف کے ان اقوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ حنفی میں عرف وزمانہ کی تبدیلی کو مسائل کے استنباط کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ بدلنے اور رسم ورواج بدلنے سے احکامات میں بھی تبدیل آتی رہتی ہے۔ عرف کا تعلق کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی عمل سے۔ عرف کا یہ مطلب ہوا کہ لوگوں کے رسوم رواج اور عادات کو دیکھ کر رائے قائم کرنا مگر یہ رائے قرآن وسنت کے کسی بھی صریح قول کے خلاف نہ ہو۔ دوسری اہم شرط یہ بھی ہے کہ عرف کا استعمال کبھی ایسے مسائل میں کیا جائے گا جہاں شریعت کے کسی واضح اور مدلل حکم میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل نہ آئے۔ اگر کوئی عرف وعادت دین اسلام کے منافی ہو تو اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔ لہذا ائمہ احناف مسائل اخذ کرنے کے لیے عرف وزمانہ کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں زمانہ وعرف کے تغیر وتبدل کے سبب شرعی

احکامات میں تبدیلی کر دی جائے۔ شریعت نے کچھ احکامات میں اتنی گنجائش رکھی ہے کہ لوگوں کی رسوم رواج اور عادات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے متعلق حتمی فیصلہ کیا جائے۔

اگر کسی وقت عرف اور شریعت کے کسی حکم کے درمیان میں کوئی لفظی و معنوی نوعیت کا تضاد آجائے تو فقہاء کے نزدیک عرف پر عمل کیا جائے گا۔ یعنی اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ اس تضاد سے مراد قرآن وسنت کے صریح احکامات سے اختلاف ہے بلکہ کسی لفظ کا مختلف معانی کے لیے استعمال ہونا وغیرہ اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ عرف عام میں اس لفظ کا کون سا معنی مراد لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ وہ فرش یا بساط پر نہیں بیٹھے گا یا یہ قسم کھائی کہ وہ سراج (چراغ) کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا پھر وہ زمین پر بیٹھا یا سورج سے روشنی حاصل کی تو وہ حانث نہیں ہو گا (یعنی اس کی قسم نہ ٹوٹے گی) اگرچہ قرآن کریم میں زمین کو فراش اور بساط فرمایا گیا ہے اور سورج کو سراج کہا گیا ہے مگر یہاں اس کے عرفی معنی مراد لئے جائیں گے۔ یعنی عرفی معنی میں فرش پکی زمین کو کہتے ہیں، لہذا یہاں قرآن نے جس کو فرش کہا ہے اس پر بیٹھنے سے وہ شخص حانث نہیں ہو گا۔

اسی طرح اگر اس نے قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے مچھلی کھائی تو حانث نہ ہو گا کیونکہ عرف میں گوشت کا استعمال مچھلی کے گوشت میں نہیں ہوتا۔ اگرچہ قرآن کریم نے مچھلی کے لئے لَحْماً طَرِیّاً (تازہ گوشت) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

> اذَا تَعَارَضَا قُدِّمَ عُرْفُ الِاسْتِعْمَالِ خُصُوصًا فِي الْأَيْمَانِ ، فَإِذَا حَلَفَ لَا يَجْلِسُ عَلَى الْفِرَاشِ أَوْ عَلَى الْبِسَاطِ أَوْ لَا يَسْتَضِيءُ بِالسِّرَاجِ لَمْ يَحْنَثْ بِجُلُوسِهِ عَلَى الْأَرْضِ ، وَلَا بِالِاسْتِضَاءَةِ بِالشَّمْسِ ، وَإِنْ سَمَّاهَا اللَّهُ تَعَالَى فِرَاشًا وَبِسَاطًا وَسَمَّى الشَّمْسَ سِرَاجًا.وَلَوْ حَلَفَ لَا يَأْكُلُ لَحْمًا لَمْ يَحْنَثْ بِأَكْلِ لَحْمِ السَّمَكِ ، وَإِنْ سَمَّاهُ اللَّهُ تَعَالَى لَحْمًا فِي الْقُرْآنِ(22)

ان دونوں مثالوں میں قرآن کے لفظی معنی کے بجائے عرفی معنی استعمال کیا گیا ہے اس سے عرف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر بعض شرعی مسائل واضح نہیں ہو سکتے۔ چونکہ الفاظ و کلمات کے معانی و مفہوم مختلف زمانوں تبدیل ہوتے رہے ہیں اور کسی بھی معاشر کے عرف میں الفاظ و کلمات کا جو مفہوم معروف ہو گیا وہی استعمال کیا جا ئے گا۔

عرف کی اقسام

عرف کے شرعی اعتبار سے مقبول ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے فقہاء نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ عرف صحیح (۲) عرف فاسد۔ عرف صحیح وہ عمل یا طریقہ ہے، جس میں نص شرعی کی مخالفت نہ ہو۔ عرف فاسد وہ عمل یا طریقہ ہے، جس میں کسی دلیل شرعی یا حکم شرعی کی مخالفت ہو، جیسے سودی کاروبار کا چلن۔(23)

ان اقوال کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام ائمہ کے نزدیک زمانہ وعرف کی تبدیلی کی بنیاد پر اجتہادی رائے پیش کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن امر ہے۔ عرف وزمانہ کی بنیاد پر اجتہادی رائے قائم کرنے کا مقصد لوگوں کے لیے شریعت اسلامی کو آسان شکل میں پیش کرنا ہے۔ جب دین اسلام کی تشریح کرتے ہوئے لوگوں کے رسوم ورواج کو مد نظر رکھا جائے گا اور ان کی عادات وضروریات کا لحاظ رکھا جائے گا تو ان کے لیے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔

ائمہ احناف کے ہاں عرف وزمانہ کی بنیاد پر فیصلہ جات، چند نظائر:

عرف وزمانہ کی تبدیلی کی بنیاد پر اجتہادی رائے استعمال کرنے کی شرعی حیثیت پر بحث کرنے کے بعد اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فقہاء نے اس کی بنیاد پر فیصلے بھی کیے ہیں کہ نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرف میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہذا فقہاء نے عملی زندگی میں اسے استعمال کرتے ہوئے بعض مسائل میں عرف کی بنیاد پر آراء قائم کی ہیں۔ ذیل میں چند ایسے مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے متعلق حتمی رائے زمانہ وعرف کی بنیاد پر قائم کی گئی۔

مصارف زکوٰۃ اگرچہ قرآن میں بیان کیے گئے ہیں مگر فقہاء کہتے ہیں کہ اس میں حالات وواقعات اور عرف وزمانہ کی بنیاد پر حاکم وقت ضرورت کے تحت رد وبدل کر سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی رائے ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں حاکم وقت ضرورت کے تحت رد وبدل کر سکتا ہے۔ اپنے مؤقف کی حمایت میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن میں جو مصارف زکوٰۃ بیان کیے ہیں ان کا آغاز کلمہ حصر سے ہوا ہے اور شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ کلمہ حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں۔ اس کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں کہ منافقین نے نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں یہ اعتراض کیا کہ آپ ﷺ زکوٰۃ کا مال چرواہوں کو دیتے ہیں ہمیں نہیں دیتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ زکوٰۃ غریبوں کا ہی حق ہے تمھارا حق نہیں۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ان آٹھ مصارف زکوٰۃ پر انحصار نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان بستے ہیں وہاں بیت المال کا سب سے بڑا ذریعہ زکوٰۃ ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ رقم صرف انہی مدات پر خرچ کر دی جائے تو پھر دیگر ضروریات کہاں سے پوری کی جائے گیں۔ اس مؤقف کو حدیث کی روشنی میں واضح کرتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں"

"بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ عَلَى الصَّدَقَةِ فَمَنَعَ ابْنُ جَمِيلٍ، وَخَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ، وَالْعَبَّاسُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا يَنْقِمُ ابْنُ جَمِيلٍ إِلَّا أَنْ كَانَ فَقِيرًا، فَأَغْنَاهُ اللَّهُ، وَأَمَّا خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ، فَإِنَّكُمْ تَظْلِمُونَ خَالِدًا، فَقَدِ احْتَبَسَ أَدْرَاعَهُ، وَأَعْتُدَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَأَمَّا الْعَبَّاسُ عَمُّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهِيَ عَلَيَّ وَمِثْلُهَا"(24) نبی اکرم ﷺ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، پس انہوں نے بتایا کہ تین لوگوں نے زکوٰۃ نہیں دی۔ ابن جمیل، خالد بن ولید اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابن جمیل تو کنگال تھا اور اس نے دعا کرائی پس اللہ نے اسے غناء کر دیا۔ جہاں تک خالد بن ولید کا تعلق ہے تو اس سے زکوٰۃ مانگ کر تم ظلم کرتے ہو، انہوں اپنی زرہیں اور سامان جنگ راہ خدا میں روک رکھا ہے اور اپنی زکوٰۃ سے سامان جنگ خرید کر مجاہدین کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اور حضرت عباس جو کہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ہیں پس ان کی زکوٰۃ میرے ذمے ہے کیونکہ انہوں نے دو سال کی اکٹھی زکوٰۃ دے دی ہے۔

اس روایت میں نبی اکرم ﷺ نے خود فرمایا کہ خالد بن ولید سے زکوٰۃ نہ مانگو کیونکہ انہوں سامان حرب خرید لیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ بوقت ضرورت مصارف زکوٰۃ میں رد بدل ہو سکتا ہے۔ ان دلائل کی بنیاد پر شاہ ولی اللہ کہتے ہیں: مصارف زکوٰۃ بوقت ضرورت تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ فقراء کے حق میں بہتری کا سبب بنے اسی طرح مجاہدین کو رقم دینے کی بجائے ان کے لیے سامان حرب خرید کر دیا جا سکتا ہے۔(25)

اسی طرح امام ابو حنیفہ کا مؤقف ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں سے مؤلفۃ القلوب ساقط ہو گیا ہے کیونکہ حالات واقعات کے پیش نظر اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ اس کے مصارف قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾(26)۔ البتہ مؤلفۃ القلوب کے متعلق کہتے ہیں" سَقَطَ مِنْهَا الْمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهُمْ ان میں سے مؤلفۃ القلوب ساقط ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مؤلفۃ القلوب کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ وہ کفار جن کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ رقم دی جاتی، دوسری قسم میں وہ لوگ شامل تھے جن کے شر سے بچنے کے لیے یہ رقم خرچ کی جاتی اور تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو اسلام لائے مگر وہ ضعیف تھے اور ان کو مستحکم کرنے کے لیے یہ رقم خرچ کی جاتی۔ مگر زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ یہ تینوں اقسام کے مؤلفۃ القلوب نہیں رہے لہذا اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس مؤقف کی دلیل میں

حضرت عامر کی روایت پیش کرتے ہیں۔((إِنَّمَا كَانَتِ الْمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهُمْ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا وَلِيَ أَبُو بَكْرٍ انْقَطَعَتْ))(4) بے شک عہد رسالت میں مؤلفۃ القلوب تھے اور عہد صدیقی میں منقطع ہو گئے۔ اس کے علاوہ کہتے ہیں اس مسئلہ پر تمام صحابہ کا اجماع بھی ہے۔لہذا امام صاحب اور بعض دیگر آئمہ احناف نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اب مصارف زکوٰۃ ساقط ہو گئے ہیں اور یہ رقم کسی اور مصرف میں استعمال کی جاسکتی ہے۔(5)

عورت کے حیض کی مدت کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے اور اس کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ شریعت نے اس کے بارے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی کہ اس کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کیا ہے۔لہذا اس کی عدت کا شمار کرنے کے لیے بھی عرف اور عادت سے مدد لی جاسکتی ہے یعنی اس مسئلہ کا حتمی فیصلہ بھی عورت کی عادت کی بنیاد پر کیا جائے گا۔لیکن حیض کا مسئلہ اجتماعی کی بجائے انفرادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ہر عورت کا معاملہ دوسری عورت سے الگ ہوتا ہے،اس میں اس کی عادات،رہن سہن اور موسمی شدت کا عمل دخل ہوتا ہے۔لہذا اگر حیض کی مدت یا اس کے خون سے متعلق کوئی مسئلہ درپیش ہو تو بہتر ہو گا کہ اسی عورت کی رائے کو حتمی سمجھا جائے۔اس کے علاوہ اس مسئلہ کے متعلق طب سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔علامہ ابن قدامہ بھی اپنی کتاب "المغنی" میں اس مسئلہ کا فیصلہ عرف اور عادت کی بنیاد پر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَلَنَا أَنَّهُ وَرَدَ فِي الشَّرْعِ مُطْلَقًا مِنْ غَيْرِ تَحْدِيدٍ، وَلَا حَدَّ لَهُ فِي اللُّغَةِ، وَلَا فِي الشَّرِيعَةِ، فَيَجِبُ الرُّجُوعُ فِيهِ إلَى الْعُرْفِ وَالْعَادَةِ،''(28)

اور شریعت نے ہمارے لیے (حیض کی مدت) میں مطلقا کوئی تحدید نہیں کی اور نہ ہی لغوی اور نہ ہی شرعی طور پر اس کی حد مقرر کی ہے۔پس اس صورت میں عادت اور عرف کی طرف رجوع واجب ہو جاتا ہے۔

آئمہ فقہاء نے اسلام کی تشریح کرتے ہوئے زمان ومکان کے تغیر و تبدل اور حالات وواقعات کے مد و جزر کو مد نظر رکھا۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر بعد والے ادوار میں امام ابو حنیفہؒ بھی ہوتے تو یہی رائے دیتے۔جیسا کہ امام محمدؒ بعض مسائل میں امام ابو حنیفہؒ سے اختلاف کرنے کے بعد کہتے ہیں۔"هَذَا اخْتِلَاف عصر وزمان لَا اخْتِلَاف حجَّة وبر هان" (29)

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگرد کے درمیان اختلاف عصری اور زمانی تھا،نہ کہ کسی دلیل اور حجت کی بنا پر۔

مثال کے طور پر عید کی نماز میں امام اور مقتدی کو حدث لاحق ہونے کی وجہ سے امام صاحب اور آپ کے شاگردوں کے درمیان اختلاف کا سبب زمانی ومکانی ہے۔امام ابن ہمام لکھتے ہیں:

وَإِنْ أَحْدَثَ الْإِمَامُ أَوْ الْمُقْتَدِي فِي صَلَاةِ الْعِيدِ تَيَمَّمَ وَبَنَى عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ وَقَالَا: لَا يَتَيَمَّمُ (30)

اگر امام یا مقتدی کا نماز عید کے دوران وضو ٹوٹ جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تیمم کر کے باقی نماز پڑھی جاسکتی ہے جب کہ صاحبین کے نزدیک تیمم نہیں بلکہ دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔

اس اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے امام فخر الدین الزیلعی کہتے ہیں:"هَذَا اخْتِلَافُ عَصْرٍ وَزَمَانٍ لَا اخْتِلَافُ حُجَّةٍ وَبُرْهَانٍ؛ لِأَنَّ جَوَابَهُ فِيمَا إذَا كَانَ الْمُصَلِّي بَعِيدًا مِنْ الْمِصْرِ وَكَانَ فِي زَمَانِهِ بَعِيدًا مِنْ الْعُمْرَانِ وَكَانَ فِي زَمَانِهِمَا يُصَلُّونَ فِي الْمِصْرِ"(31)

یہ اختلاف زمانی و مکانی ہے نہ کہ کسی دلیل کی بنیاد پر کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں شہر سے دور باہر میدان (عید گاہ میں) جاکر نماز عید ادا کی جاتی تھی جب کہ صاحبین کے زمانہ میں نماز عید شہر میں ہی ادا کی جاتی تھی۔اس مسئلہ میں امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف کا سبب کوئی قرآن وحدیث کی دلیل نہیں اور نہ ہی کسی حدیث کا ضعیف ہونا ہے بلکہ اس اختلاف کا سبب سراسر زمان ومکان کا تغیر ہے۔چونکہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں شہر سے دور آسانی سے پانی میسر نہیں تھا لوگوں کو وضو ٹوٹنے کی صورت میں دوبارہ وضو کرنے میں دقت پیش آتی،لہذا امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر نماز عید کا آغاز وضو سے کیا اور دوران نماز وضو ٹوٹ گیا تو بقیہ نماز تیمم کرنے سے ادا ہو جائے گی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ممکن ہے دوبارہ وضو کی خاطر پانی کی تلاش میں اس کی نماز ہی نہ جاتی رہے۔اس کے برعکس صاحبین کے دور میں چونکہ نماز عید شہر میں ہی ادا ہونے لگی تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ وضو ٹوٹنے کی صورت میں تیمم نہیں بلکہ دوبارہ وضو کرنا پڑے گا کیونکہ پانی بآسانی دستیاب تھا۔

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان ایک اور اہم مسئلہ میں اختلاف رائے کا سبب بھی عرف وزمانہ کی بنا پر ہوا۔ فقہ حنفی اور دیگر فقہی مذاہب کا اولین ترجیح یہی رہی ہے کہ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں،مشکلات کو دور کیا جائے ،دین کو آسان دین کے طور پر پیش کیا جائے اس کے لیے جہاں دیگر اہم ضروریات زندگی کا لحاظ رکھا گیا وہاں گزرتے حالات واقعات اور ان کے ساتھ ضروریات کا بھی لحاظ رکھا گیا۔عرف وزمانہ کی بنیاد پر فقہاء نے بہت زیادہ فیصلے کیے تاکہ اس علاقے وزمانے کے لوگ دین کے مزید قریب آئیں۔مثلا امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عشر،زمین کے مالک کے ذمہ ہوتا ہے کیونکہ زکوۃ ملکیت کا ٹیکس ہے۔امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مؤقف ہے کہ عشر کرایہ دار کے ذمے ہوگا،کیونکہ پیداوار پر زکوۃ واجب ہے اور کرایہ دار پیداوار کا مالک ہے لہذا وہی عشر دے گا۔(32)

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے درمیان پائے جانے اس اختلاف پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن عابدین لکھتے ہیں۔

"ہمارے زمانے میں کرایہ کی زمین پر عشر کا مسئلہ بار بار سامنے آتا ہے، اس بارے میں میری رائے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مؤقف کی حمایت کرتی ہے۔ کیونکہ وہی قول درست ہے اور اگر امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق ہمارے زمانے میں فتویٰ دیا جائے تو بیت المال اور اوقاف کی زمینوں سے بہت بڑا نقصان پہنچتا ہے جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ لہذا ابن عابدین نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ عرف کے قریب تر ہے۔ امام ابن عابدین کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ احناف قرآن وحدیث اور قیاس کے بعد عرف کو بھی اپنی فقہ کی بنیاد بناتے ہیں۔ اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں عرف وزمانہ کی بنا پر اپنی رائے قائم کی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان اختلاف "عرف" کی بنیاد پر ہی ہے اور بعد میں امام ابن عابدین نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مؤقف کو ترجیح عرف کی بنا پر ہی دی ہے۔(33)

قرآن کی تعلیم دینا، امامت کے فرائض سر انجام دینا اور دیگر دینی امور سر انجام دینے کو ایک عادت شمار کیا جاتا ہے۔ لہذا ایسے امور کی انجام دہی کے لیے اجرت لینا اصلا ممنوع سمجھا جاتا تھا اور اس کی اجرت اجر وثواب کی صورت میں آخرت میں حاصل کرنے کا تصور پایا جاتا تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب بیت المال کے دروازے مذہبی و دینی امور سر انجام دینے والوں کے لیے بند کر دیے گئے اور ان کو معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اس پریشانی بچنے کے لیے اہل علم نے ذاتی کام کاج کی طرف توجہ دینا شروع کر دی، یعنی انہیں معاشی حاجات کی تکمیل کے لیے زراعت اور صنعت اور دیگر کاروباری امور کی ادائیگی میں مشغول ہونا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قاری و عالم دین ذاتی کام کاج میں مشغول ہو گئے، جس سے دین کے ضیاع کا اندیشہ لاحق ہو گیا، لہذا فقہاء نے فتویٰ دیا کہ امامت، اذان اور تعلیم قرآن جیسے امور کی انجام دہی کے لیے اجرت لینا جائز ہے۔ اسی بات کو امام ابن عابدین اپنی کتاب مجموعہ رسائل میں نقل کرتے ہیں۔

"پس اس طرح فقہاء نے قرآن کی تعلیم دینے پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا اور اسی پر فتویٰ دیا ہے، جو کہ اس سے پہلے مسلمانوں نے ناجائز سمجھتے ہوئے روک رکھا تھا۔ اور اگر معلمین اجرت کے بغیر دینی امور سر انجادیں گے تو لازمی بات ہے وہ اور ان کے اہل وعیال کے ضیاع کا خدشہ پیدا ہو گا اور اگر وہ اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہوں، جیسا کہ زراعت وصنعت وغیرہ میں، تو اس طرح دینی امور اور قرآن کی تعلیم کے ضائع ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہذا ان خدشات

کے پیش نظر بعد والے فقہاء نے فتویٰ جاری کیا کہ قرآن کی تعلیم اور دیگر دینی امور کی سر انجام دہی کے لیے اجرت لینا جائز ہے۔(34)

بعض امور ایسے ہیں جہاں عرف وزمانہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو نقصان کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا مسئلہ میں اگر عرف وزمانہ کے پیش نظر یہ فیصلہ نہ کیا جاتا اور دین اسلام کی تبلیغ کے فرائض سر انجام دینے والوں اور تعلیم قرآن دینے والے قاریوں کی اجرت مقرر نہ کی جاتی تو بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے۔ اس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہونے کا خدشہ تھا، دینی امور سر انجام دینے والے اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناپسندیدہ امور بھی سر انجام دے سکتے تھے یا دینی معاملات بہت زیادہ متاثر ہو سکتے تھے لہذا عصر حاضر میں بھی اسی بات پر فتویٰ دیا جائے گا کہ ایسے لوگوں کی نہ صرف اجرت مقرر کی جائے۔ بلکہ حالات وضروریات کے مطابق مناسب اجرت مقرر ہونی چاہیے تاکہ وہ معاشی مسائل سے بے نیاز ہو کر ساری توانائیاں دینی امور پر صرف کر سکیں۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم قرآن اور دیگر دینی امور کی انجام دہی پر اجرت لینے کے معاملے جو حتمی فیصلہ کیا گیا اس کی بنیاد زمانہ وعرف کی تبدیلی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا زمانہ خیر القرون میں آتا ہے جس میں حق کا بول بالا تھا اور لوگوں میں جھوٹ بولنے کا اتنا زیادہ رواج نہیں تھا لہذا انہوں نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ کسی مسئلہ میں گواہوں کی پیشی کے لیے ظاہری عدالت ہی کافی ہے اس پر کسی ثقاہت کی ضرورت نہیں۔ جبکہ صاحبین کا زمانہ آیا تو انہوں نے لوگوں میں بہت زیادہ بے احتیاطی دیکھی تو انہوں نے گواہ کے لیے تزکیہ کی بھی شرط عائد کر دی۔ کیونکہ حالات بدل گئے جھوٹ عام ہو گیا اس لیے ظاہری عدالت کے ساتھ کچھ دیگر شرائط بھی عائد کر دی گئیں۔ ابن عابدین اس مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔"ان هذا اختلاف عصر وان لا اختلاف حجة وبرهان-(35)

امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے درمیان اختلاف رائے بھی عرف وزمانہ کی بنیاد پر کیا گیا۔ جیسا کہ الہدایہ میں ہے"لو حلف لا يأكل رأس فهو على رؤوس البقر والغنم عند أبي حنيفة رحمه الله وقال أبو يوسف ومحمد رحمهما الله على الغنم خاصة " وهذا اختلاف عصر وزمان كان العرف في زمنه فيهما وفي زمنهما في الغنم خاصة وفي زماننا يفتي على حسب العادة كما هو المذكور في المختصر"(36)اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ سر (کا گوشت) نہیں کھائے گا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے مراد گائے اور بکری کے سر کا گوشت ہے، جب کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس سے مراد صرف بکری کے سر کا گوشت ہے، اور یہ "اختلاف رائے" عرف کی تبدیلی اور زمان کے سبب تھا۔ کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں جو عرف تھا انہوں وہی مراد لیا جب کہ صاحبین کے زمانہ میں جو عرف استعمال ہوتا تھا انہوں وہی مراد لیا ہے۔ گویا ہر کسی نے اپنے زمانہ اور عرف عادت کی بنیاد پر فتویٰ دیا ہے۔ اس مسئلہ

میں اختلاف رائے کی بنیاد بھی زمان ومکان کی تبدیلی ہی ہے۔یعنی امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں لوگ ایسے گوشت کے لیے گائے اور بکری دونوں کے لیے بولتے تھے، لہذا انہوں اسی پر اپنا فتویٰ جاری کر دیا جب کہ صاحبین کے زمانہ میں سر کے گوشت کے لیے فقط بکری کے سر کا گوشت مراد لیا جاتا تھا، لہذا انہوں اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

اس مثال میں ایک لفظ کے دو معنی استعمال ہوئے ہیں ایک لغوی اور دوسرا عرفی، ایسی صورتوں میں ہمیشہ عرفی معنی استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ بعض اوقات اس چیز کے لغوی معنی قرآن میں استعمال ہوتا ہے مگر عرفی معنی زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے جس سے عرف کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اگر ہر چیز کا لغوی معنی مراد لینا شروع کر دیا جائے اور عرفی معنی کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے بہت سے مسائل پیدا ہونگے کیونکہ عامۃ الناس کے ہاں عرف کچھ اور ہوتا ہے اور لغوی معنی کچھ اور ہوتا ہے۔لہذا شریعت اسلامیہ کی تشریح وتوضیح کے لیے ضروری ہے کہ عرف وعادت کو ملحوظ رکھا جائے

۔

عصر حاضر میں بھی بعض مسائل ایسے ہیں جن کے حل کے لیے عرف کا سہارا لینا پڑتا ہے، تاکہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان مسائل کا حل پیش کیا جاسکے۔اظہار خوشی کے لیے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، جس میں شادی کی خوشی، بچے کی پیدائش پر خوشی وغیرہ۔شریعت ہمیں خوشی کے اظہار سے منع نہیں کرتی، بلکہ عرف وزمانہ اور علاقائی رسم ورواج کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں کی عادات کے مطابق خوشی کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا(37) اے نبی ﷺ فرما دیجئے، اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے ملنے پر خوشی منایا کرو۔اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل کسی بھی صورت میں ہو اس کے بدلے میں خوشی کا اظہار کیا کرو، کیونکہ اللہ کی نعمتوں پر خوشی کا اظہار کرنا اظہار تشکر کی علامت ہے۔مگر یہ خوشی شریعت کی قائم کردہ حدود وقیود کے اندر ہونی چاہیے، اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاسکتا ہے، مثلاً غرباء میں کھانا تقسیم کر کے، بچوں میں مٹھائی تقسیم کر کے، ذکر ونعت کی محفل سجا کر اور اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کر کے بھی اظہار تشکر کیا جاسکتا ہے۔خوشی کے پروگراموں میں مرد وعورت کا اختلاط، لڑکوں اور لڑکیوں کا اکٹھا ڈانس اور منگنی کے نام پر غیر شرعی رسوم کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔اسی طرح مختلف علاقوں میں شادی کی تقریبات کی رسوم مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، ان تقریبات میں سے کسی کو درست اور کسی کو غلط نہیں کہا جاسکتا، البتہ جس تقریب میں شریعت اسلامیہ کی خلاف ورزیاں کی جارہی ہوں گی ، وہ غلط ہے خواہ اس علاقے کی رسم ہی کیوں نہ ہو۔اور اپنے علاقہ وعرف کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے شادی کی خوشی کرنا بلکل جائز ہو گا۔اسی طرح غمی کے اظہار کے بھی مختلف علاقوں میں مختلف طریقے ہوتے ہیں، جس میں اس علاقے کی رسوم رواج شامل ہوتے ہیں۔اسی طرح قومی زندگی میں آج کل لوگ خوشی کے اظہار کے لیے

جشن آزادی مناتے ہیں کیونکہ قرآن نے خاص ایام کو یاد کرنے کا حکم دیا ہے جن ایام میں اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص انعام ہوا ہو قومی آزادی ایک بہت بڑی نعمت اور اللہ کا انعام ہے۔اس کو قومی سطح پر منایا جاتا ہے، باہر سڑکوں پر اس آزادی کی نعمت کا اظہار کیا جاتا ہے، قومی سطح پر کانفرنسز منعقد کی جاتی ہیں، جلسے اور جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لہرائی جاتی ہیں، ملک بھر میں عمارتوں پر چراغاں کیا جاتا ہے، ان ساری رسومات کا تعلق بھی عرف وزمانہ کے ساتھ ہے اگر ان میں کوئی شرعی فعل سرزد نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔شریعت عرف کالحاظ رکھتے ہوئے ہر کسی کو اپنے علاقے کی رسم ورواج کے مطابق اظہار غمی کی بھی اجازت دیتی ہے، بشرطیکہ خلاف شرع کوئی فعل سرزد نہ ہو۔الغرض عصری مسائل میں بہت سے کاروباری مسائل ہیں، لین دین کے مسائل ہیں، جن میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہوتا ہے، بینک اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان میں عرف وزمانہ کالحاظ رکھتے ہوئے مسائل کے حل کی اجازت دی جاسکتی ہے، تاکہ اسلام کو آسان دین کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

خلاصہ کلام

دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کا مقصد لوگوں کی فلاح بہبود کے ساتھ ان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔اسلام لوگوں کے مسائل کم کرنے کے لیے آیا ہے نہ کہ مزید مسائل پیدا کرنے لیے، لہذا اس کی تشریح وتوضیح میں ہر اس چیز کو شامل کیا جاسکتا ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو اور جس سے عامۃ الناس کو اجتماعی طور پر فائدہ ہو۔زمانہ وعرف کی تبدیلی کی بنیاد پر اجتہادی آراء کا اظہار اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو کہ لوگوں کی عادات اور روزمرہ زندگی کے معمولات پر منحصر ہوتا ہے۔ہر زمانہ میں لوگوں کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر جگہ پر بسنے والے باسیوں کے مسائل ایک جیسے ہوتے ہیں۔اگر قرآن وسنت میں ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے ایک ہی قسم کے احکامات بیان کردیے جاتے اور ان کی تحدید میں زمان ومکاں کے تغیر وتبدل کا خیال نہ کیا جاتا تو دین میں جمود طاری ہو جاتا اور آنے والے حالات اور ان کے مسائل کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا پڑتا۔اس کے برعکس اسلام نے جمود کے خاتمے اور اجتہادی رائے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اجتہادی آراء پیش کرنے کے لیے جہاں قرآن وسنت بطور دلیل استعمال کرنے کا حکم دیا گیا وہاں زمانہ وعرف کو بھی ملحوظ رکھنے کا درس دیا۔قرآن میں بعض مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا کہ "عرف" کے مطابق اس کا فیصلہ کرو، اسی طرح احادیث مبارک میں بہت مسائل موجود ہیں جن کی تشریح بھی عرف کے مطابق ہی کرنے کا حکم دیا گیا۔اگر ان مسائل کا حل کسی خاص علاقے یا خاص حالات کے مطابق پیش کرکے اس کی تحدید کردی جاتی تو دوسرے علاقے اور بعد والے لوگوں کے لیے بہت زیادہ مسائل پیدا ہوتے۔لہذا قرآن وسنت نے

ایسے مسائل میں لچک پیدا کرتے ہوئے حالات واقعات کے مطابق فیصلہ جات کرنے کا حکم دیا ہے بشرطیکہ وہ اسلام کو اصول و قوانین کے خلاف نہ ہوں۔ فقہاء اسلام نے اسی روایت پر عمل کرتے ہوئے فقہی مسائل کی تشریح و تعبیر بیان کرتے ہوئے زمان و مکان کے تغیر و تبدل اور لوگوں کے حالات واقعات کا خاص لحاظ رکھا۔ فقہاء کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف رائے کا سبب بھی یہی ہے کہ ایک امام کے دور کے حالات کچھ اور ہوتے وہ اسی کے مطابق فیصلہ دیتا جب کہ دوسرے امام کے زمانہ میں تغیر پیدا ہو جاتا اور دوسرا امام اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فتویٰ دیتا۔ لہذا فقہاء احناف کے درمیان "اختلاف رائے" کے جہاں دیگر اسباب ہیں وہاں ایک سبب زمانہ وعرف کی تبدیلی بھی ہے۔ فقہ حنفی کے ہر مجتہد نے اپنی اجتہادی رائے پیش کرتے ہوئے جہاں ضروری سمجھا عرف کا استعمال کیا اور لوگوں کی نفسیات کے مطابق فیصلے دیے جو اس فقہ کی شہرت اور مقبولیت عامہ کا سبب ہے۔

حوالہ جات

1- ابن منظور ،محمد بن مكرم بن على الإفريقى ـلسان العرب ـ بيروت: دار صادر 1414 ھ ـج:9،ص:239

2- ابوالحسین، احمد بن فارس بن زکریا395ھ، مقاییس اللغہ، دار لفکر الطباوالنشر، ج:4، ص:281

3- أبو حبيب الدكتور سعدي – القاموس الفقهي لغة واصطلاحا– دمشق: دار الفكر. 1988 ء–ج:،ص:249

4- عینی، أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بدر الدين ـعمدة القاري شرح صحيح البخاري ـ بيروت : دار إحياء التراث العربي– ج:13،ص:189

5- البقرہ2:233

6- ابو بکر الجصاص، احکام القرآن، بیروت دار إحياء التراث العربي –تاريخ الطبع: 1405 ھ، ج2، ص104

7- البقرہ2:234

8- الاعراف7: 199

9- ابن عربی ، القاضي محمد بن عبد الله أبو بكرـ أحكام القرآنـ بيروت :دار الكتب العلمية، 2003ءـ ج:2،ص:359

10- بخاري ، محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري ـالجامع الصحيح ـ دار طوق النجاة, 1422ھ ـكِتَابُ النَّفَقَاتِ ،بَابُ إِذَا لَمْ يُنْفِقِ الرَّجُلُ فَلِلْمَرْأَةِ أَنْ تَأْخُذَ بِغَيْرِ عِلْمِهِ مَا يَكْفِيهَا وَوَلَدَهَا بِالْمَعْرُوفِ،ج:7،ص:65،رقم الحديث: 5364

11- ابن حجر،احمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي- فتح الباري شرح صحيح البخاري- بيروت: دار المعرفة ،1379ھ بَابُ نَفَقَةِ الْمَرْأَةِ إِذَا غَابَ عَنْهَا زَوْجُهَا وَنَفَقَةُ الْوَلَدِ, ج: 9 ،ص:509،

12- دارمي ،أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن ـ سنن الدارمي ـ صحيح ابن حبان ـ بيروت :مؤسسة الرسالة ، 1993ء ـ ، بَابٌ مَا جَاءَ فِي حَجِّ النَّبِيِّ صَلَّى الله عليه وسلم واعتماره ،ج:9 ،ص:253،رقم الحديث : 3944

13- ابن حجر- فتح الباري شرح صحيح البخاري-ج: 9 ،ص:509

-14 احمد بن حنبل،ابو عبد الله الشيباني-مسند الإمام أحمدبن حنبل- مؤسسة الرسالة،الطبعة: الأولى، 2001 ء ؛مُسْنَدُ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ،ج:1،ص:379،رقم الحديث: 3600

-15 محمد ابو زہرہ ۔ ابو حنیفہ حیاتہ و عصرہ ، آراہ وفقہ۔ دارلفکر العربی۔۔ص:396

-16 ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز ۔،مجموعہ رسائل ابن عابدین ۔۔ص:98

-17 سرخسی، محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة ۔المبسوط ۔ بيروت : دار المعرفة 1993ء ۔۔ج:19،ص:41

-18 السرخسي ،محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة - شرح السير الكبير- الشركة الشرقية للإعلانات، 1971ء- ج:1،ص:1721

-19 ابن قيم ،محمد بن أبي بكر ۔إعلام الموقعين عن رب العالمين۔ بيروت: دار الكتب العلمية ۔ -ج:3،ص:11

-20 ابن عابدين۔ مجموعہ رسائل۔ج:2،ص:125

-21 ایضا۔ص:125

-22 ابْنِ نُجَيْمٍ، الشَّيْخ زَيْنُ الْعَابِدِيْنَ ۔الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ۔ بيروت :دار الكتب العلمية، 1400ھ:ص :97

-23 ابوزہرہ۔اصول الفقہ۔ص:278

-24 ابو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق السِّجِسْتاني۔سنن أبي داود ۔کتاب الزکوۃ، بَابٌ فِي تَعْجِيلِ الزَّكَاةِبيروت : المكتبة العصرية،ج:2،ص:115،رقم الحدیث: 1623

-25 دھلوی،احمد بن عبد الرحيم شاہ ولی اللہ ۔ حجة الله البالغة ۔ لبنان : بيروت ، دار الجيل، 2005۔ج:2،ص:69

-26 التوبہ 60:9

-27 ابن ابی شیبہ ،أبو بكر بن أبي شيبة۔ المصنف في الأحاديث والآثار ۔کتاب الزکوۃ،فِي الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ يُوجَدُونَ الْيَوْمَ أَوْ ذَهَبُو الرياض: مكتبة الرشد، 1409ھ ۔ا،ج:2،ص:،رقم الحدیث: 1075

-28 ابن الهمام ،كمال الدين محمد بن عبد الواحد – فتح القدير – دار الفكر۔ج:2،ص:259

-29 ابن قدامة، أبو محمد موفق الدين عبد الله الحنبلي۔المغني لابن قدامة ۔ القاهرة :مكتبة، 1388ھ ۔ ج:1،ص:225

-30 شيبانی، أبو عبد الله محمد بن الحسن ۔الجامع الصغير۔ بيروت :عالم الكتب 1406 ھ ۔-ج: 1،ص:256

-31 ابن ہمام۔فتح القدیر-ج:1،ص:138،

-32 زيلعی، عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين ۔تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق ۔ القاهرة :المطبعة الكبرى الأميرية بولاق، 1313 ھ ۔ ج:1،ص:43

-33 ابن عابدين، رد المحتار على الدر المختار،ج:1،ص:334

-34 ایضا۔ص334

-35 ابن عابدین۔جموعہ رسائل ابن عابدین۔ج:2،ص:125-126

-36 ایضا۔ج:2،ص:126

-37 مرغينانی، علي بن أبي بكر أبو الحسن برهان الدين – الهداية في شرح بداية المبتدي – لبنان : بيروت دار احياء التراث العربي –ج:2،ص:336

-38 یونس10، آیت58